نثار احمد

پی ایچ۔ ڈی اسکالر،

شعبہ اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

ڈاکٹر وحید قریشی بطور کالم نگار

Nisar Ahmed

PhD Scholar, Urdu Department,

National University of Modern Languages, Islamabad

Dr. Wahid Qurashi as a Columnist

This article throws light on a different aspect of the life of great researcher and writer Dr. Waheed Qureshi and that is his being a newspaper columnist. Dr. Waheed Qureshi had multidimensional personality. He was a noted linguist, critic, poet, writer, researcher, administrator, educationalist and scholar of Urdu literature and oriental languages. This aspect of his personality, being newspaper columnist , remained hidden so for. His satirical literary columns are a manifestation of his wit. The article includes all necessary information about Dr. Waheed Qureshi and also a few paragraphs from his columns which prove him to be an effective columnist. In early 70s he used to write under a pen name "Mir Jumla Lahorei" But in 90s he wrote in the Daily "Jang" with his own name. His columns are mostly about political affairs of Pakistan

---

استادالاساتذہ، ڈاکٹر وحید قریشی کا شمار پاکستان میں اردو زبان وادب کے معماروں میں ہوتا ہے۔ وہ ایک نامور محقق، ممتاز نقاد، بلند پایہ مورخ اور خوش فکر شاعر کے طور پر ملکی اور بین الاقوامی سطحوں پر اردو دان طبقے میں نمایاں ترین پہچان رکھتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے ان کی علمی وادبی خدمات کی لاتعداد جہتیں ہیں جن کا آسانی سے احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بہت کم لوگوں کو علم ہوگا کہ ڈاکٹر وحید قریشی موصوف بڑے اچھے " کالم نگار " بھی تھے اور انھوں نے اپنی علمی زندگی کے آغاز سے آخر تک " کالم نگاری کا شغل " بھی اپنائے رکھا " کالم نگاری "ادب وصحافت کی وہ خوش قسمت صنف ہے جس میں اردو کے تقریباً ہر نامور شاعر اور ادیب نے طبع آزمائی کی ہے۔ خالصتاً ادبی وعلمی شخصیات میں سے پنڈت رتن ناتھ سرشار سے لے کے احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین، ابن انشاء، شوکت تھانوی، امجد اسلام امجد،، پروین شاکر، عطاالحق قاسمی، منو بھائی، منیر نیازی، جمیل الدین عالی، مشفق خواجہ، ڈاکٹر وحید قریشی، مولانا کوثر نیازی، انور مسعود، مستنصر حسین تارڑ، سید ضمیر جعفری،

اور ڈاکٹر محمد یونس بٹ تک اردو کا کون سا ایسا نامی گرامی شاعر و ادیب گزرا ہے جس نے کالم نگاری نہ کی ہو۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے اخباری کالموں کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ ان کی ذاتی لائبریری سے دریافت ہوا ہے جس سے ان کی شخصیت کے اس پہلو پر گراں قدر معلومات ملتی ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی کی ولادت 14 فروری 1925ء کو ان کے نانا کے گھر میانوالی میں ہوئی۔ ان کا اصل نام عبدالوحید تھا۔ والد محمد لطیف قریشی محکمہ پولیس میں ملازم تھے۔ ان کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا، اس لیے ڈاکٹر صاحب کی سکول کی تعلیم مختلف شہروں میں ہوئی۔ 1944ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔اے آنرز اور 1946ء میں اورینٹل کالج لاہور سے ایم اے فارسی کیا۔ بعدازاں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے تاریخ اور ڈی لٹ اردو کی ڈگریاں بھی حاصل کیں۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی لکھتے ہیں کہ:

> ڈاکٹر صاحب نے بچپن ہی سے گھر میں ادبی ماحول دیکھا تھا۔ اقبال کی "بانگ درا" اور ادبی جریدے "عالمگیر" اور "نیرنگ خیال" وغیرہ والد صاحب کے مطالعے میں رہتے تھے۔ انہی کی ورق گردانی سے ادبی مطالعے کی ابتداء ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کے اتالیق بھائی خورشید بھی اچھا شعری ذوق رکھتے تھے۔ شاعری سے لگاؤ اور شاعری کا فنی شعور ان کے اثر سے بیدار ہوا۔ کالج کے زمانے ہی سے اپنی لائبریری بنانے کا شوق پیدا ہوا۔ ایک جگہ لکھا ہے، "1922ء میں جب گورنمنٹ کالج لاہور میں میرا دوسرا سال تھا۔ جدید اردو شاعری اور فارسی شاعری کی کتابیں جمع کرنے لگا۔" اسی زمانے میں انہوں نے شاعری شروع کی اور اختر شیرانی، حفیظ جالندھری اور احسان دانش کے تتبع میں شعر کہے۔ کالج میں اپنے فارسی کے استاد صاحب اسلوب شاعر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کی ادبی تربیت سے بھی شعر گوئی کے شوق کو جلا ملی۔(1)

1951ء میں انھوں نے اسلامیہ کالج گوجرانوالہ میں تاریخ کے لیکچرار کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا۔ اسلامیہ کالج لاہور میں تاریخ اور فارسی اور پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور میں اردو کے استاد رہے۔ پنجاب یونیورسٹی میں مختلف مناصب (صدر شعبہ اردو، پرنسپل اورینٹل کالج لاہور، ڈین کلیہ علوم شرقیہ و اسلامیہ) پر بھی فائز رہے۔ 1983ء سے 1987ء تک مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کے صدر نشین رہے۔ مختلف اوقات میں بطور اعزازی معتمد بزم اقبال لاہور، ناظم اقبال اکادمی پاکستان اور مہتمم مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور خدمات انجام دیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی اردو اور فارسی زبان و ادب کے ایک اہم محقق اور نقاد تھے۔ ان کا زیادہ تر سرمایہ ادب تنقیدی کتب پر شامل ہے۔ اگرچہ وہ اردو اور فارسی میں شعر بھی کہتے تھے لیکن ان کی تحریروں پر تحقیق کی چھاپ گہری ہے۔ ان کے علمی کارناموں پر حکومتِ پاکستان نے انھیں تمغہ برائے حسن کارکردگی عطا کیا۔

ان کی تصانیف میں اسیاسیاتِ اقبال، نذرِ غالب، کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ، اقبال اور پاکستانی قومیت، مطالعہ ادبیات فارسی، پاکستان کی نظریاتی بنیادیں، مقالاتِ تحقیق، تنقیدی مطالعے، اردو نثر کے میلانات، مطالعہ حالی اور میر حسن اور

ان کا زمانہ شامل ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے کالموں کے ذخیرے میں سے ان کے پچاس کی، ساٹھ کی، اسّی کی اور نوے کی دہائیوں میں لکھے گئے کالم ملے ہیں:

مگر "جملہ لاہوری" کے قلمی نام سے فکاہات کے مستقل عنوان سے لکھے گئے اپنے ایک کالم میں رقم طراز ہیں:

> جب سے حکومت نے وزن کے پیمانے بدلے ہیں کراچی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کو کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ پی ایچ ڈی کے قواعد کے مطابق اردو پی ایچ ڈی کی بنیادی شرط یہ ہے کہ مقالے کا وزن کم از کم پانچ سیر ہو۔ اعشاری نظام رائج ہونے کے بعد سے پرانے باٹ استعمال کرنا جرم قرار دیا گیا ہے اس لیے ایک تجویز یہ ہو رہی ہے کہ مقالے کا کم از کم وزن نئے حساب سے پانچ کلو کر دیا جائے لیکن بعض فضلا کو اس سے شدید اختلاف ہے۔ ان کی رائے میں اس سے پرانے پی ایچ ڈی حضرات کی حق تلافی ہوگی۔ گمان غالب یہ ہے کہ اب سابقہ امیدواروں سے پانچ سیر کو ساڑھے چار کلو کے برابر شمار کیا جائے گا۔ معاملہ سنڈیکیٹ کی آئندہ نشست میں زیر غور آئے گا۔(2)

ڈاکٹر وحید قریشی ساری زندگی درس و تدریس سے وابستہ رہے۔ بہت سے ناموں کے پی ایچ ڈی کے گائیڈ رہے۔ پی ایچ ڈی کے مقالوں کے روایتی انداز میں ضخیم ہونے پر گہرا طنز کر رہے ہیں۔ کہنا چاہ رہے ہیں کہ ایسے مقالے محض ضخیم ہوتے ہیں۔ محقق بھی مقالے کی ضخامت اور وزن پر توجہ دیتے ہیں تحریر اور تحقیق پر توجہ نہیں دیتے۔ تحقیقی مقالوں کا ہمیشہ سے یہ المیہ رہا ہے کہ معیار سے زیادہ مقدار کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔ نتیجتاً بھرتی کے مواد سے جس کا موضوع کے ساتھ کوئی تعلق واسطہ نہیں وہ مقالے میں ٹھونسا جاتا ہے کہ یوں مقالہ وزنی تو ہوتا جاتا ہے مگر جس مقصد کے لیے لکھا جاتا ہے اس سے دور ہوتا جاتا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی اسی رویے کو ہدف تنقید بنا رہے ہیں مگر انداز ایسا ہے کہ قاری کے ہونٹوں پر تبسم بکھرتا جاتا ہے۔ جب ناپ تول کے پرانے، گزوں، سیروں، منوں کی جگہ میٹروں، گراموں، کلوؤں نے لی تو ایک عرصہ تک عام لوگ ہر ایک چیز کی ناپ تول کرتے وقت پرانے اور نئے پیمانوں کا ایک ساتھ ذکر کیا کرتے تھے۔ یہ اسی دور کا کالم ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی طنزاً کہہ رہے ہیں کہ پی ایچ ڈی کے مقالے کے لیے پانچ سیر وزن مقرر تھا جواب نئے نظام میں 5 کلوگرام کر دیا گیا ہے۔ ایک کلوگرام میں سے ایک اعشاریہ دو سیر وزن ہوتا ہے تو اس طرح نئے محققین کے ساتھ یہ زیادتی ہوگئی ہے کہ پانچ سیر کی بجائے پانچ کلوگرام مواد مہیا کرنے کے پابند ہوں گے۔ وہ طنزاً اور مزاحاً کہتے ہیں اس زیادتی کا ازالہ یوں کیا جائے کہ اب نئے نظام کے پیمانے میں مطلوبہ وزن ساڑھے چار کلوگرام کر دیا جائے۔ "جملہ لاہوری" کے قلمی نام سے "فکاہات" کے مستقل عنوان کے تحت "اکیڈمی آف لیٹرز کانفرنس" کے موضوع پر لکھے ہوئے ایک کالم میں رقمطراز ہیں:

> لوہاری دروازے کے باہر ٹانگوں کے اڈے پر یہ آوازیں سننے میں آتی ہیں کہ دلی دروازے چلو ریلوے سٹیشن چلو۔۔۔ فی سواری چار آنے۔ اب ہوائی اڈے پر یہی صدائیں گونجتی ہیں کہ اسلام آباد چلو، ادیبوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہیں۔ گلابی جاڑا آیا اور اسلام آباد کی قسمت جاگی۔

اہل قلم کانفرنس کی افواہیں گرم ہوئیں۔ یارلوگوں نے تیاریاں شروع کیں۔ مسیح الدین صدیقی ابھی جھنڈیاں ہی باندھ رہے ہیں کہ سکھ یاتری لاہور سے اسلام آباد پہنچنے شروع ہوگئے۔ اہل قلم کون ہیں کون نہیں۔ رائٹرز اکیڈمی والے اس باریکی مین نہیں پڑتے۔ جس کی جیب میں بال پوائنٹ نظر آیا ادیب ہوگیا۔ اگر گنتی میں کوئی کسر رہ گئی تو دو چار "فن کار" شامل کر لیے۔ "قانون ضرورت" کے تحت دو چار سرکاری افسر بھی ادیب شمار ہو جائیں تو اچھا ہے۔ اور اہتمام کے ساتھ کانفرنس کا انعقاد ہو رہا ہے۔ ادیب، دانشور اور جملہ اہل وطن اسلام آباد میں جمع ہو جاتے ہیں۔ کانفرنس کے خاتمے کے بعد اسلام آباد کی رونق دیدنی ہوتی ہے۔ ادیب آئندہ سال کا دعوت نامہ پکا کرنے کے لیے اخباروں میں سفرنامے لکھتے ہیں جنہیں لکھنا نہیں آتا وہ اہل قلم کانفرنس کے منتظمیں کی شان میں مکتوبات لکھوا کر اخباروں میں شائع کراتے ہیں ۔ اپنا مستقبل سنوار لیتے ہیں۔ ادیبوں اور دکانداروں کی ہجرت کی وجہ سے کراچی کی گلیاں سونی ہو جاتی ہیں۔ سارے شہر میں مشفق خواجہ کے سوا کوئی ادیب باقی نہیں رہتا۔ مشفق خواجہ بھی اس لیے پیچھے رہ جاتے ہیں کہ وہ کسی تقریب میں نہیں جاتے اور ویرانے کو پسند کرتے ہیں۔ سنا ہے زندگی میں صرف ایک تقریب میں انہوں نے شرکت کی تھی اور وہ ان کی شادی کی تقریب تھی۔ کراچی کے بارے میں خواجہ کے کچھ اپنے تصورات ہیں۔ خالی شہر اچھا لگتا ہے، اس لیے اکثر ادیبوں پر لاٹھی چارج کرتے ہوئے پائے گئے ہیں۔ اہل قلم کانفرنس کے انعقاد میں اور ادیبوں کی کراچی بدری میں ان کا ہاتھ تو ضرور ہوگا کہ اس مخلوق سے چند روز کے لیے تو چھٹکارا حاصل ہو۔ یارلوگ اسے "مشفق خواجہ مسیح سازش" کا نام دیتے ہیں۔ اگر آپ سے دوم (میم) (م + میم) سازش کہنا پسند نہ کریں تو کراچی کا "لندن پلان" کہہ لیجیے۔(3)

اس کالم میں ڈاکٹر وحید قریشی نے اکیڈمی آف لیٹرز کانفرنس میں ہرایرے غیرے کو بلا لیے جانے، اور اس بہانے سفارشیوں اور غیر متعلقہ لوگوں کو نوازانے کے رجحان پر گہرا طنز کیا ہے۔ وہ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ بظاہر تو یہ کانفرنس ادیبوں اور شاعروں کے لیے بلائی جاتی ہے مگر اس میں بلا تخصیص سب کو بلا لیا جاتا ہے۔ وہ لوگ جن کا شعر و ادب سے دور کا بھی واسطہ نہ رہا ہو حکومتی خرچے پر چار دن اسلام آباد کی سیر کرنے کے لیے لاہور، کراچی اور دیگر شہروں سے بلا لیے جاتے ہیں۔ یہ لوگ دوران کانفرنس تو مزے کرتے ہی ہیں کانفرنس کے اختتام پر یہ ٹولہ خوشامدیوں کا روپ دھار کر صاحبانِ اقتدار کے در پر آ کھڑا ہوتا ہے۔ درحقیقت یہ اگلے سال دوبارہ اس کانفرنس میں شرکت کو یقینی بنانے کے لیے جدوجہد میں جت جاتے ہیں۔ جنھیں لکھنا آتا ہے وہ اخباروں میں لکھ لکھ کر انتظامیہ کی خوشامد کر کے اپنا "مستقبل" روشن کرتے ہیں اور جو لکھنے سے قاصر ہیں مکتوبات لکھوا کر اخباروں میں چھپواتے ہیں یوں وہ منتظمین کو راضی کر کے اگلے سال کی دعوت پکی کر لیتے ہیں۔ کالم کے دوسرے حصے میں میں مشفق خواجہ کے کراچی سے کبھی نہ نکلنے اور "گوشہ نشین"

رہنے پر لطیف پیرائے میں طنز کیا ہے اور مبالغے سے کالم لیتے ہوئے کہا کہ مشفق خواجہ نے آج تک ایک ہی تقریب میں شرکت کی ہے جو ان کی اپنی شادی کی تقریب تھی۔ دو میم سازش اور "لندن پلان" کی بلیغ اصطلاحیں بھی خوب استعمال کی ہیں۔

بدعنوانی اور اقربا پروری وہ برائیاں ہیں جن کا ذکر قائداعظم نے پاکستان کی قانون ساز اسمبلی سے اپنے پہلے خطاب (11 اگست 1947) میں کیا تھا۔ قیام پاکستان سے بھی قبل سے جسدِ قومی کو لاحق یہ بیماریاں ایسی ہیں کہ جنھوں نے ریاست کے ہر انگ کو گھن کی طرح کھا لیا ہے مگر بدقسمتی سے ان پر قابو نہیں پایا جا سکا۔ بدعنوانی، اپنے عزیز و اقارب اور دوست احباب کو سرکاری خزانے سے نوازنے کا مظاہرہ جہاں بھی ہو محبِّ وطنوں کا دل دکھتا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی جیسے حساس انسان کے لیے "اکیڈمی آف لیٹرز کانفرنس" کے موقع پر ان برائیوں کے کھلے عام ارتکاب نے ان کو ان کے خلاف قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا ہے۔ نوے کی دہائی میں ڈاکٹر وحید قریشی روزنامہ "جنگ" میں "حاصلِ کلام" کے مستقل عنوان سے کالم لکھا کرتے تھے۔ اس کالم کے ساتھ ان کی تصویر بھی چھپا کرتی تھی۔ ایسے ہی ایک خالصتاً سیاسی کالم میں لکھتے ہیں:

> سردیوں کا موسم ہے۔ لانگ مارچ کی آمد آمد ہے۔۔۔۔ خدا چین کا بھلا کرے جس نے ہمیں آڑے وقت میں حوصلہ بھی دیا اور لانگ مارچ کی اصطلاح بھی دی۔ ہم نے حوصلے سے کم فائدہ اٹھایا اور لانگ مارچ سے زیادہ۔ بیس بائیس سال ادھر ہم صرف ایک اصطلاح سے آشنا تھے اور وہ تھی "مارچ" فون کی مارچ کا ہم نے بہت تجربہ کیا۔ 1958ء سے لے کر اب تک مارشل لاء کی مارچ کے مزے اٹھا رہے ہیں حتیٰ کہ "کثرتِ استعمال" سے مارشل لاء ہمارے لیے "معمول کی کاروائی" ہو کر رہ گیا ہے۔ مارشل لاء آتا ہے تو ہمارے سیاستدان پھولوں کے ہار لے کر پذیرائی کے لیے نکل آتے ہیں۔ پھر اچانک ہمیں خبر ملتی ہے کہ مارشل لاء اچھی چیز نہیں۔ یہ امریکہ والے بھی عجیب لوگ ہیں ہر کام کی خرابیاں ہمیں بہت بعد میں بتاتے ہیں۔ ہم مارشل لاء کی جگہ جمہوریت کا راگ ذرا اونچے سروں میں الاپتے ہیں۔ راگ اونچے سروں میں گایا جائے وہ بھیرویں ہے اور ذرا نیچے سروں میں گانے لگیں تو "میاں کی ٹوڈی" برآمد ہوتی ہے۔ گانے کا قصہ چھوڑیئے بات جمہوریت کی ہو رہی تھی۔ ہم بار بار جمہوریت کا دامن تھامتے ہیں اور ہر بار ہمارے ہاتھ میں مارشل لاء آ جاتا ہے اور ہمیں ایک بار پھر شدت کے ساتھ "کوئک مارچ" کی یاد ستانے لگتی ہے۔ ہم الٹے پاؤں چلنے لگتے ہیں اور پھر ہماری ریل گاڑی مارشل لاء کے سٹیشن پر آ کر رک جاتی ہے۔(4)

1988ء کے بعد شروع ہونے والے نام نہاد جمہوری دور میں سیاسی جماعتوں اور سیاست دانوں کی آپس کی لڑائیوں، ایک دوسرے کی حکومت گرانے کے جائز و ناجائز حربوں اور سیاسی جلسے جلوسوں نے عام آدمی ہی نہیں وطنِ عزیز کے سنجیدہ اور

تعلیم یافتہ طبقے کو بھی اچھا خاصا پریشان کر رکھا تھا۔ ایک حکومت بنتی تو مخالف پارٹیاں اسے گرانے کے لیے جلسے جلوسوں کا اہتمام کرنے لگتیں۔ لانگ مارچ پاکستان میں سب سے پہلے بےنظیر بھٹو نے کیا اور پھر ہر کوئی کرنے لگا۔ ڈاکٹر وحید قریشی اسی رجحان کو تنقید کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ قیام پاکستان سے اب تک زیادہ عرصہ وطن عزیز مارشل لاء کے زیر سایہ رہا ہے۔ سیاست دانوں کی غیر سنجیدگی بڑھتی ہے تو مارشل لاء آ جاتا ہے۔ مارشل لاء آنے کے بعد سیاست دان اس کا خوش دلی سے استقبال کرتے ہیں مگر پھر اچانک مارشل لاء والے نئی حکومت کے خاتمے کے لیے سرگرم ہو جاتے ہیں یوں ایک نام نہاد جمہوریت سے مارشل لاء اور مارشل لاء سے جمہوریت کی طرف سفر نے حکومتی انتظام بلی چوہے کا کھیل بنا کر رکھ دیا ہے جس پر سنجیدہ حلقے انگشت بدنداں رہے۔ اسی کالم میں آگے لکھتے ہیں:

> جلوس کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ مردوں کا جلوس نکلے تو لانگ مارچ، عورتوں کا ہو تو لونگ مارچ کہلاتا ہے۔ آج کل بی بی کے جلوس زیادہ بارونق ہوتے ہیں۔ نوابزادہ نصراللہ خان بھی پچوان اٹھائے سڑکوں پر آ گئے ہیں اور دھرنی مار کر بیٹھ گئے ہیں۔ کھر بھیا کو آج کل فرصت ہے۔ ویسے بھی عورتوں کے جلوس ان کی کمزوری ہیں اس لیے وہ بھی گلی کوچے میں بڑھکیں مارتے پھر رہے ہیں۔ پیر پگاڑا کے بھی وارے نیارے ہیں۔ پیش گوئیوں کا موسم ہے۔۔۔۔۔ روز ایک بیان۔۔۔۔ روز ایک خبر، کبھی اپنے حق میں کبھی اپنے خلاف۔۔۔۔۔ کبھی فوج کی حمایت میں کبھی جنتا کی تائید میں۔۔۔۔ باتیں بہرحال مزے کی کرتے ہیں اور سالگرہ اس سے زیادہ اچھی مناتے ہیں۔ کیک کاٹنا انہیں پسند ہے۔ کبھی اپنی سالگرہ کا کیک کاٹتے ہیں اور مزے لے لے کر انگلیاں چاٹتے ہیں۔ کبھی دوسرے کی سالگرہ منا ڈالتے ہیں۔ اخبار نویس انہیں پسند کرتے ہیں کیونکہ وہ مزاحیہ کالم اچھا بولتے ہیں۔ اگر کبھی لکھنے پر آ گئے تو کئی مزاح نگاروں کو پیچھے چھوڑ جائیں گے۔ قوم کو مشورے کی ضرورت ہو تو یہ اسے لطیفے سناتے ہیں۔ لطیفوں کی ضرورت ہو تو سگار سلگا کر لمبی تان لیتے ہیں۔ ہمیشہ اچھی بات غلط موقع پر کہتے ہیں اور غلط بات ہر وقت کہتے رہتے ہیں۔ آج کل بےنظیر کے بازو پر امام ضامن باندھنے میں مصروف ہیں لیکن اندر سے یہ خواہش بھی رکھتے ہیں کہ نواز شریف ان کے دست حق پرست پر بیعت کر لے۔ کئی اشارے دے چکے ہیں لیکن جانے ہماری قوم کو کیا ہو گیا ہے کہ کسی کی کوئی سنتا ہی نہیں۔ (5)

لانگ مارچ سے "لونگ مارچ" کی کشید زبردست ہے۔ کالم کے اس حصے میں بعض جملے ایسے لکھے ہیں کہ امکان یہی ہے کہ قارئین اخبار رکھ کے دیر تک قہقہے لگاتے رہے ہوں گے۔ پیر صاحب پگاڑا کے کردار کو چند جملوں میں ایسے اچھے انداز میں بیان کیا ہے کہ تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے۔ ملکی سیاسی تاریخ کا یہ کردار بھی بےمثال اور لازوال لگتا ہے اور اس کی خصوصیات کا احاطہ جتنے اچھے انداز سے ڈاکٹر وحید قریشی نے کیا ہے شاید ہی کوئی اور کر پایا ہو گا۔

ڈاکٹر وحید قریشی کا عکس ان کے کالموں کی تحریروں میں ان کی دیگر تحریروں سے بالکل نہیں تو کسی حد تک مختلف ضرور نظر آتا ہے۔ اپنے ان فکاہی کالموں میں انھوں نے بہت ہی سادہ اور عام فہم زبان استعمال کی ہے۔ سادہ اور عام فہم اس اعتبار سے کہ " کالمی " تحریروں میں انھوں نے نہ تو ثقیل ادبی اصطلاحات استعمال کی ہیں اور نہ دیگر شاعر و ادیب کالم نگاروں کی طرح بات بات پر عام آدمی کی سمجھ میں نہ آنے والے "ادبی تحریروں کے حوالے دیئے ہیں اور نہ ہی شعراء ادبا کی طرف بلیغ اشارے کیے ہیں۔ انھوں نے سیدھی سادی باتیں کی ہیں جو شعر و ادب سے شغف نہ رکھنے والا اخبار کا عام قاری بھی نہ صرف آسانی سے پڑھ سکتا ہے بلکہ سمجھ کے لطف بھی اٹھا سکتا ہے۔

کالموں میں ڈاکٹر وحید قریشی کے موضوعات متنوع رہے ہیں۔ وہ اس نقطے کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اخبار کے لیے لکھی گئی تحریر ایک مخصوص طبقے کے لیے نہیں ہونی چاہیے۔ لہذا انھوں نے جو کچھ بھی لکھا وہ عام قاری کے لیے لکھا۔ اور انھوں نے صرف ادبی ہی نہیں سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی موضوعات پر بھی قلم اٹھایا۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنے کالموں کی تحریروں میں مزاحیہ سے زیادہ طنزیہ اسلوب برتا ہے۔ ان کا طنز نہایت گہرا اور کاٹ دار ہوتا ہے مگر ان کا کمال یہ ہے کہ وہ نشانے کو اس کی ذرا سی بھی چبھن محسوس نہیں ہونے دیتے۔ طنز کرتے کرتے مبالغے کی حد تک چلے جاتے ہیں۔ قاری ان کے ایک ایک جملے سے لطف اندوز ہوتا اور سر دھنتا ہے۔ ایک بار جو کالم پڑھنا شروع کر دے سارا پڑھے بغیر نہیں چھوڑتا اور یہی کالم کی تحریر کی سب سے بڑی خوبی سمجھی جاتی ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی کے کالموں کی زبان سادہ و عام فہم سہی مگر اس کی ادبی چاشنی سے انکار ممکن نہیں۔ کشور ناہید نے سچ کہا تھا کہ ایک ادیب کا کالم ہی " ادب " ہوتا ہے۔(6) ڈاکٹر وحید قریشی ادیب ہی نہیں ادیبوں کے پیر و مرشد مانے جاتے ہیں لہذا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ان کی تحریر میں ادبیت سرے سے ہی غائب ہو جائے۔ ان کے کالموں کو پڑھتے ہوئے اعلیٰ پائے کے انشائیے کا گمان ہوتا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کی اردو زبان و ادب کے لیے کی گئی کوششوں کو سراہتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

> ڈاکٹر صاحب ایک صاحبِ بصیرت نقاد اور محقق ہی نہیں بلکہ ایک دانشور، شاعر اور اردو زبان کے لیے ایک بہت بڑے ستون بھی ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مولوی عبدالحق، مولانا صلاح الدین احمد اور ڈاکٹر سید عبداللہ کے بعد ڈاکٹر وحید قریشی ہی نے اردو زبان کو سب سے زیادہ سہارا دیا ہے۔ بالخصوص مقتدرہ کے ذریعے وہ اردو کو سرکار دربار کے علاوہ گلیوں اور بازاروں تک پہنچانے میں خوب کامیاب ہوئے ہیں۔ انھوں نے اردو زبان کے دامن کو اتنا کشادہ کر دیا ہے کہ اب اردو نہ صرف مغربی علوم کو بآسانی خود میں جذب کر رہی ہے بلکہ سرکاری محکموں کی ساری مشکلات کو بھی حل کرنے پر قادر ہو گئی ہے۔ (7)

حواشی

۱۔ گوہر نوشاہی، ڈاکٹر پاکستانی ادب کے معمار، ڈاکٹر وحید قریشی شخصیت اور فن اکادمی ادبیات پاکستان H-8/1 اسلام آباد ص 21,22

۲۔ مخطوطہ مزاحیہ تحریریں ذاتی لائبریری ڈاکٹر وحید قریشی

۳۔ مخطوطہ "مزاحیہ تحریریں "ذاتی لائبریری ڈاکٹر وحید قریشی

۴۔ روزنامہ جنگ لاہور 27 دسمبر 1992

۵۔ روزنامہ جنگ لاہور 27 دسمبر 1992

۶۔ کشور ناہید جواب سوالنامہ مقالہ نگار، مورخہ 15 جنوری 2012

۷۔ مخطوطہ اعترافِ کمال، ذاتی لائبریری ڈاکٹر وحید قریشی